ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

اس وقت میں والدِ مرحوم مولانا سالک کے کتب خانے میں بیٹھا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اپنے نہایت ہی شفیق بزرگ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بارے میں اپنے تاثرات کا آغاز کہاں سے کروں۔ وہ میرے دوست نہیں تھے، میرے باپ کے دوست تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی پیاری تھی کہ جو اُن سے چند لمحے بات کر لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی عظمت کا کمال یہ تھا کہ جو شخص ان کے آستانے پر حاضری دیتا اُس سے یوں ملتے جیسے وہ سچ مچ ان کا دوست ہو۔ خواہ وہ شخص کتنا ہی ادنےٰ کیوں نہ ہو۔ تصور کیجئے ایک طرف خلیفہ عبدالحکیم، ایک عظیم فلسفی، اسلامی مسائل کے ہر پہلو سے آگاہ، ماہرِ تعلیات، اعلیٰ پائے کا ادیب، نقاد اور شاعر، اور دوسری طرف راقم الحروف۔ ایک اخبار نویس اور صحافت کا معمولی معلم اس وسیع بُعد کے باوجود انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ذہنی طور پر ان سے کہیں کمتر ہوں۔ یقیناً اس میں یہ حقیقت بھی کارفرما ہو گی کہ میں اُن کے دوست کا فرزند تھا۔ لیکن میں نے انہیں اوروں سے بھی گفتگو کرتے دیکھا ہے اور ان کے کردار میں یہ چیز نمایاں پائی ہے کہ وہ امتیازِ مراتب کے اتنے زیادہ قائل نہیں تھے۔

والدِ مرحوم کہتے تھے میرے نزدیک دو شخص ایسے ہیں جو گفتگو کے بادشاہ ہیں اور محفل آرائی میں کمال رکھتے ہیں۔ ایک حکیم احمد شجاع، دوسرے خلیفہ عبدالحکیم۔ لیکن دونوں کی گفتگو کے انداز میں فرق ہے۔ اول الذکر ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں اور اپنی گفتگو سے بعض اوقات حاضرین پر رقت کا تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے برعکس خلیفہ عبدالحکیم کی گفتگو سے محفل کی محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور ایسے ایسے لطیفے ہو جاتے ہیں جو مدتوں تک ذہن میں آ آ کر ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو یاد ہے ایک دفعہ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر کی ایک دعوت میں خلیفہ صاحب بھی مدعو تھے۔ میں سلام کو آگے بڑھا تو فرمانے لگے۔ کارٹون چھپوا دیا نا؟ میں تھوڑی سی دیر الجھن میں رہا کہ وہ کس کارٹون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ دو لمحوں میں سمجھ گیا کہ ان کی مراد "پاکستان ٹائمز" کے اس کارٹون سے ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر میاں افضل حسین صاحب کی تعلیم، پالیسی پر طنز کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کی بنیاد میاں صاحب کا وہ بیان تھا جس میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کو صرف ذہین طلبہ تک محدود کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ میں نے فوراً کہا "کارٹون مجھے چھپوانے کی کیا ضرورت تھی، میاں صاحب بات ہی اس انداز

سے کرتے ہیں کہ کارٹونسٹ لپک کر آتا ہے اور چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس کا مذاق اڑا دیتا ہے۔ کہنے لگے ان کے بیان کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟" میں نے کہا "چھوٹا منہ بڑی بات۔ آپ کے سامنے میں اپنی رائے کیسے پیش کروں"۔ انہوں نے نہایت پیار سے کاندھے پر ہاتھ رکھا "نہیں! نہیں! تم ضرور بتاؤ۔ میں نے سنا ہے تم ان کے بڑے حامی ہو" میں نے قدرے حجاب کے ساتھ کہا "اُن کی باتوں کو اگر دلیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نہایت وزنی اور کھری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ــــ لیکن وہ غالباً یہ نہیں جانتے کہ ان غیر معمولی نظریات کو "گروہ در گروہ" پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ پہلے ایک نظریہ پیش کریں اور جب تک لوگ اسے اچھی طرح ہضم نہ کر لیں دوسرا نظریہ سامنے نہ لائیں، اور پھر جو بات کہیں اگر یہ ڈر ہو کہ لوگوں کو کڑوی لگے گی تو اس پر شکر کا خول چڑھا دیں۔ اس سے ان کی عظمت میں کمی نہ ہوگی، اضافہ ہی ہوگا"۔ اس پر خلیفہ صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا "بھئی میرا خیال بھی یہی ہے کہ میاں صاحب کے تعلیمی نظریات صحت مند ہیں لیکن ان کا حال اس باپ کی طرح ہے جس کا ایک جوان بیٹا تھا۔ اس نے سوچا لڑکے کا رشتہ کر دوں۔ چنانچہ ادھر ادھر گھومنے لگا۔ کبھی ایک سے بات کی کبھی دوسرے سے لیکن اسے نہ صرف ہر جگہ مایوسی کا سامنا ہوتا بلکہ کہیں کہیں پٹائی بھی ہو جاتی۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست سے مشورہ کیا کہ ہر شخص لڑکے والوں کی قدر کرتا ہے لیکن میری پٹائی ہو جاتی ہے حالانکہ میرا لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ صاحب جائیداد ہے اور برسرِ روزگار ہے۔ بھلا اس سے بہتر رشتہ کیا ہوگا۔ دوست نے پوچھا۔ جب تم کسی لڑکی والے کے پاس جاتے ہو تو کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ بات بالکل سیدھی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ تمہاری لڑکی جوان ہے۔ ہمارا لڑکا جوان ہے اور ازل سے ابد تک یہی رسم چلی آتی ہے کہ جوان لڑکی اور جوان لڑکے کے ملاپ سے دنیا قائم ہے۔ اس سیدھی سادی بات سے لڑکی کے باپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے تم ہی بتاؤ۔ آخر کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟ اب دوست کو معلوم ہوا کہ پٹائی کیوں ہوتی ہے۔ اس نے کہا تمہاری نیت کا قصور نہیں۔ صرف بات کا ڈھنگ غلط ہے۔ اب کسی لڑکی کے باپ کے پاس جاؤ تو پہلے ادھر ادھر کی اچھی اچھی باتیں کرو۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اپنے لڑکے کی تعلیم، جائیداد اور ملازمت کا ذکر کر دو۔ اس کے بعد چلے آؤ۔ پھر دوسری ملاقات میں اسی طرح کی تمہید باندھو۔ اور بڑے ادب سے کہو کہ میرے فرزند کو اگر آپ اپنی فرزندی میں لے لیں تو میرے لیے یہ سرمایۂ فخر و افتخار ہوگا۔ یہ فرما کر خلیفہ صاحب کہنے لگے۔ بس میاں صاحب کو یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

لاہور میں تو خلیفہ صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور وہ بھی ان کی زندگی کے آخری دنوں میں۔ لیکن مری میں چونکہ مال روڈ سب کی ملاقات کا اڈہ ہے۔ اس لیے وہاں ان سے سرِ راہے کئی بار ملاقات ہوتی تھی اور ہمیشہ ایک آدھ لطیفہ ہو جاتا تھا۔ مری کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے وہ دولہا تھے۔ مری لٹریری یونین جب "لن ٹاٹ" رستوران

میں کوئی خصوصی تقریب منعقد کرتی تو خلیفہ صاحب ضرور مدعو ہوتے اور اپنی شخصیت کے حسن اور کشش سے ساری محفل پر چھا جاتے اور لطائف و ظرائف کا ایک دریا تھا کہ مسلسل بہا جاتا تھا۔ انہی محفلوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ بیاض لے آتے تھے اور سنانے پر آتے تو احباب کی فرمائش پر غزلیں اور طویل نظمیں پڑھتے۔ اور حاضرین کی پیاس تھی کہ مٹنے میں نہ آتی تھی۔

وفات سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک نجی کام کے سلسلے میں ان کے دولتکدے پر گیا۔ بات لمبی ہو گئی اور میں نے سگرٹ پینا چاہا۔ (بزرگوں کے سامنے سگرٹ پینے میں میں مضائقہ نہیں سمجھتا کہ والد صاحب کے سامنے بھی ایسا کوئی حجاب نہیں تھا) لیکن میں نے دیدہ و دانستہ سگرٹ کیس نہ نکالا۔ وجہ یہ تھی کہ میں قینچی کا سگرٹ پینے کا عادی تھا اور ہوں۔ لیکن میں نے سوچا۔ اگر ان کے سامنے سگرٹ کیس کھولا۔ تو انہیں بھی سگرٹ پیش کرنا ہوگا اور وہ تو اسٹیٹ ایکسپریس پیتے ہوں گے۔ ایسے میں قینچی کا سگرٹ پیش کرنا زیادتی ہوگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی جیب سے قینچی کی ڈبیا نکالی اور سگرٹ سلگا کر پینے لگے۔ اس سے میرا حجاب ٹوٹ گیا اور میں نے بھی اپنا سگرٹ سلگا لیا۔ بعد میں والد صاحب سے معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مستقل طور پر اسی سگرٹ کے عادی ہیں۔

ان کی زندگی میں سے صرف چند دن باقی تھے کہ مجھے ان سے ایک ادبی کام کے سلسلے میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن دنوں والد صاحب بیماریٔ قلب کے ایک شدید حملے سے بچ گئے تھے۔ خلیفہ صاحب ہمیشہ پہلے ان کا حال پوچھتے۔ اس دفعہ بھی ان کا حال پوچھا۔ اور پھر کہنے لگے ان کی عمر کیا ہوگی؟ میں نے کہا چونسٹھ برس۔ تو ہنس کر کہنے لگے کہ بھئی اب اتنی عمر میں تو ایسے عوارض لاحق ہوتے ہی ہیں۔ اب تو ہم لوگوں کا چل چلاؤ ہے۔ اور کیسے معلوم تھا کہ یہ سرخ و سفید چہرہ جو عمر کی پختگی کے باوجود جوانوں سے بہتر نظر آتا تھا۔ چند روز بعد اپنی تمام مسکراہٹوں، لطیفوں اور شگفتگیوں کو لے کر وہاں چلا جائے گا۔ جہاں پہنچ کر کوئی نہیں لوٹا۔

خلیفہ صاحب کی شخصیت کے پہلو بے شمار ہیں۔ اُن کے علم و فضل سے ایک دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ دینی مسائل سے ان کی آگہی نے بے شمار ایسے نوجوانوں اور بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو اپنے دین کے قریب کر دیا جن کے ذہن ہلے ہوئے تھے اور خیالات متزلزل تھے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر انہوں نے ایک ایسا سلسلہ جاری کر دیا جس سے ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی طور پر اسلام کے زیادہ قریب آ رہا ہے۔ آخری عمر کی بے پناہ محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے پاس ان کی زندگی بھر کے حاصل کئے ہوئے علم کا نچوڑ موجود ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری خدمات ایسی ہیں جن کا صحیح اندازہ عالم و فاضل شخصیتیں ہی کر سکتی ہیں۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ عقیدت کے پھول پیش کر دوں۔